اشرف صبوحی دہلوی

کوئل زنانہ

ہیجڑوں، بھانڈوں اور زنانوں کا بھی ہندوستان میں بڑا زور تھا۔ درباروں سرکاروں تک رسائیاں تھیں۔ دنیا میں اور جگہ بھی یہ مخلوق پیدا ہوتی ہوگی، لیکن خدا جانے وہاں انھیں کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو اُن کی خوب آؤ بھگت تھی۔ جس محفل میں یہ نہ ہوتے رانڈ سمجھی جاتی۔ ان میں بھی بڑے بڑے نامی گزرے ہیں۔ اَچپل، گلزار بھانڈ، شہزادہ، دولھا ہیجڑے، شام گھٹا اور کوئل زنانے اپنے اپنے وقت کے چمکتے ہوے ستارے تھے۔

وہ جو کہتے ہیں، جسے پیا چاہے وہی سہاگن۔ کسی نے سچ کہا ہے:

خاک سارانِ جہان را بحقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

دنیا والے انھیں کسی نظر سے کیوں نہ دیکھیں، کیسا ہی حقیر و ذلیل سمجھیں، اللّٰہ میاں کی مہربانیاں خاص نہیں عام ہیں۔ بارش جب ہوتی ہے کوڑی اور باغ پر یکساں۔ سورج جب چمکتا ہے پھول اور کانٹے سب اُس کی شعاعوں سے برابر مستفید ہوتے ہیں:

سنگ کیوں لعل ہوا؟ نیّر اعظم کی نگاہ
دانہ کیوں سبز ہوا؟ مسکرمتِ ابرِ سیاہ

ایسی اچھوتی مخلوق میں بعض بعض صاحبِ کمال بھی تھے۔ کہتے ہیں آخری وقت میں غدر کے بعد کا ذکر ہے ایک ہیجڑے کو جو حج کی دُھن سمائی تو اپنے سارے دھندے چھوڑ، اگلے پچھلے گناہوں سے توبہ کر، گہنا پاتا بیچ سفر کی تیاری کرلی۔ سن رکھا تھا کہ گندی کمائی کے روپے سے حج نہیں ہوتا۔ مولویوں کے پاس پہنچا لیکن سب نے دھتکار دیا۔ بہت پریشان، دل میں شمعِ رسالت کی لو لگی ہوئی، خیال آیا درویشوں سے پوچھنا چاہیے۔ اُن دنوں ایک رند مشرب ملنگ شاہ میر کی بڑی شہرت تھی۔ ہچکچاتا ہوا اُن کے پاس پہنچا۔ شراب کا دور چل رہا تھا، دور سے دیکھتے ہی بولے، ـاَبے حرام حلال کرنے والوں کے پاس جا،

یہاں تو پینی پڑے گی۔

بیچارا چپ کھڑا ہوگیا۔

شاہ میر: حج کا ارادہ اور مولویوں کی معرفت؟

ہیجڑا: حضور، سب کہتے ہیں کہ تیرا روپیا گندا ہے۔

شاہ میر: پھر وہ اپنی کوثر کا چھینٹا دے کر پاک نہیں کر سکتے؟

ہیجڑا غریب کیا جواب دیتا۔ چپ منہ دیکھنے لگا۔

شاہ میر: کھڑے کھڑے جائے گا؟ بیٹھتا کیوں نہیں؟

ہیجڑا: (بیٹھ کر) حضور!

شاہ میر: (شراب کی پیالی بھر کر) لے یہ تو پی۔

ہیجڑا: قبلہ توبہ کر چکا ہوں۔

شاہ میر: تو حج بھی ہو چکا۔ ابے، اسی میں غوطہ مار کر حج ہوگا۔

ہیجڑا: پیر و مرشد۔

شاہ میر: جا تو پھر مولیوں سے فتویٰ لے۔ یہاں تو اسی راہ سے حج کو بھیجا کرتے ہیں۔

شاہ صاحب کی لال لال آنکھیں دیکھ کر کچھ تو وہ ڈرا اور کچھ اُن پر اعتقاد، جھٹ پیالا اٹھا منہ سے لگا لیا۔ عجب مزا پایا۔ شراب کیا تھی، دودھ اور شہد کے گھونٹ تھے۔

شاہ میر: ہاں بھئی، حج کو جاؤگے؟ کتنا روپیا ہے؟

ہیجڑا: کچھ کم دو ہزار۔

شاہ میر: اچّھا، کل اسی وقت یہاں لے آنا۔ ہم اسے پاک کر دیں گے۔

ہیجڑا کچھ دیر بعد وہاں سے اٹھ کر اپنے گھر آیا۔ دن بھر اور رات بھر سوچتا رہا کہ روپیا کس طرح پاک ہوسکتا ہے؟ شرابیوں کی باتیں ہیں، کوئی اور فتور نہ پڑ جائے۔ صبح ہوئی، دل دھکڑ پکڑ تھا، مگر حج کی چٹیک بھی لگی ہوئی تھی۔ روپیا پوٹلی میں باندھ سیدھا تکیے پہنچا۔

شاہ میر: (ہیجڑے کو دیکھتے ہی پکار کر) آگئی سونے کی چڑیا۔ (اپنے چیلے چانٹوں سے) کیا دیکھتے ہو، لُوٹ لو۔ بھٹّی بنائیں گے۔ خدا نے دن پھیر دیے۔

وہاں کیا دیر تھی، اور ہیجڑے بیچارے کی کیا ہستی۔ جا دبوچا۔ پوٹلی چھین حصّے بخرے ہونے لگے۔ اس کی سٹّی گم، حواس باختہ، نہ لڑنے کی طاقت نہ واویلا مچانے کا دھرم۔

جنگل بیاباں قبرستان میں کون اس کی فریاد سنتا۔

شاہ میر: کیوں بھئی حج کو جانے کا ارادہ ہے؟

ہیجڑا: (آنسو بہا کر) میاں، اب میں کیا کروں؟ حرام حلال کی جیسی کمائی تھی وہ بھی تم نے لٹوا دی۔

شاہ میر: اللہ کو یاد کرو۔

ہیجڑا: ہارے کی فریاد اللہ ہی سننے والا ہے۔

شاہ میر: تو بھئی پاؤں پیدل چلے جاؤ۔

ہیجڑا: میاں اتنا دم ہوتا تو اب تک کبھی کا چلا جاتا۔

شاہ میر: (پیالا بھر کر) اچّھا لو، اسے پیو اور تمھاری ہم کیا خاطر کریں۔ کڑھو نہیں، حج کو جانے کا بھی انتظام ہو جائے گا۔

ہیجڑا دم بخود۔

شاہ میر: (لال لال آنکھیں چمکا کر) پیتا ہے یا نہیں۔ زیادہ نخرے کیے تو یاد رکھ ابھی سونٹا پڑنے لگے گا۔

ہیجڑا غریب سہم گیا۔ پینی پڑی۔ اب کے مرشد کے پیالے میں کچھ اور رنگ تھا۔

شاہ میر: (اپنے چیلوں سے) یارو، ایک غریب حج کو جانا چاہتا ہے۔ حسبِ توفیق اس کی مدد کرو۔ جو جس کے پاس ہو، اسے دے دو۔

اتنا کہنا تھا کہ سب نے اپنی اپنی لوٹ کے روپے نکال کر سامنے رکھ دیے۔ ہیجڑے کو حیرت ہوئی۔ رومال پھیلا جلدی جلدی سمیٹنے لگا۔

شاہ میر: بس بھئی اب تو خوش ہوئے۔ لو سدھارو اور جا کر اپنے مولویوں سے فتویٰ بھی چاہے لے لو۔ اٹھو روانہ۔ پیرِ مغاں سے ہمارا بھی سلام کہہ دینا۔

چنانچہ اسی سال وہ حج کو گیا اور وہیں کا ہو رہا۔ ہر برس حاجی آکر سناتے کہ ہیجڑے کی تو تقدیر کھل گئی۔ روضۂ اقدس پر اپنے سر کے بالوں سے جھاڑو کر تا ہے:

کیا شان دکھائی ہے اے سوختا سامانی
اُس شمعِ رسالت کا پروانہ بنا دیکھا

کوئل زنانہ نام سے ظاہر ہے کہ آبنوسی رنگ کا ہوگا۔ کوئل کو تو مرے ہوے کم از کم چالیس برس ہوئے ہوں گے، شام گھٹا تو ابھی کوئی پندرہ برس ہوے مرا ہے۔ حج کر کے

خاصی صوفیوں مولویوں کی سی وضع اختیار کر لی تھی۔ کوئل کا رنگ اس سے زیادہ وارنشی تھا۔ لڑکپن کے زمانے کا کیا پوچھنا۔ زنانوں کی ٹولی میں جب پہلے پہل گایا ہے تو عاشق مزاجوں کے دلوں کا ستھراؤ کردیا۔ دلّی کے ہیجڑا پرستوں کا اس کے کوٹھے پر رمنا لگ گیا۔ کہتے ہیں گپو کارخانہ دار کے بیٹے سانولیا نے اسی پر افیم کھائی تھی۔ لال کنوئیں پر کئی دفعہ چاقو چلے تھے۔ ہیجڑوں کی وضع قطع، بولی ٹھولی تو دیکھی سنی ہوگی، کوئل کی رسیلی آنکھیں، چمکیلا رنگ، صاف ستھرا ناک نقشہ، پھر پھبن۔ اس بانکپن پہ کون نہ مرتا۔ اچھے اچھے ثقہ آنکھیں چرا چرا کر دیکھتے۔ صوفیوں کو دھوئیں میں بجلیاں چمکتی نظر آتیں۔ طور کا جلوہ دیکھتے۔ کنہیّا بن کر جس وقت وہ بانسری بجاتا، اس کی آواز پر ہزاروں برسوں کی بھٹکی ہوئی گوپیوں کی روحیں جمع ہو کر تھرکنے لگتیں۔

لیکن رہے نام سائیں کا۔ جوانی کا سایہ کیا اٹھا، روپ کیا ڈھلا کہ کوئل آندھی کا کوّا بن گئی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چھجّو شاہ ایک مجذوب فقیر نے اپنا کرشما دکھایا۔ یہ ان کے پاس اکثر جایا کرتا تھا۔ انھوں نے سر دھنتے دھنتے سونٹا زمین پر مار کر کہا: ’’مانگ کیا مانگتا ہے؟ اس وقت چودہ طبق کھلے ہوے ہیں۔ بول بادشاہ بنا دوں یا اپنا بنا لوں؟‘‘ انھیں یہ رٹ لگی ہوئی تھی اور کوئل حیران۔ جب چھجو شاہ کا جوش زیادہ بڑھا تو وہ سونٹا زمین پر مارتے مارتے کھڑے ہو گئے اور اس نے دیکھا کہ مجھے نہ پیٹنے لگیں تو دور بھاگ کر بولا: ’’سائیں، نہ میں بادشاہ بننا چاہتا ہوں اور نہ تم جیسا۔ دعا کرو عمر بھر میاں کو رجھایا کروں۔ میاں ریجھ گئے تو بیڑا پار ہے۔‘‘

اتنا سنتے ہی چھجو شاہ کا جوش ٹھنڈا ہوگیا۔ سونٹا ہاتھ سے پھینک دیا اور قہقہہ لگا کر بولے، ’’جا جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔ جا میاں کو رجھایا کر۔ ان کے من میں آگئی تو کسی دن ریجھ بھی جائیں گے۔‘‘

اس روز کے بعد سے کوئل کی کایا پلٹ گئی۔ کیسا گانا بجانا، کہاں کا ناچنا تھرکنا، تالیاں پٹخارنا۔ کوئی ہفتہ بھر نہ گزرا ہوگا کہ کوٹھے پر سے بھی غائب، جتنے منہ اتنی باتیں۔ کوئی کہتا کسی کے ساتھ بھاگ گیا۔ کوئی کہتا بھاگنے کی رُت میں تو بھاگا نہیں۔ چھجو شاہ کی ہوا لگ گئی۔ دو ہفتے سے رنگ کچھ بدلا ہوا تھا۔ غرضیکہ یونہی تذکرے ہو ہو کر رہ گئے۔ شہروں میں ایسے بہتیرے واقعات ہوتے ہیں۔ کون ڈھنڈیا مچاتا ہے۔ اس کے ساتھیوں کو البتّہ صدمہ ہوا۔ آخر وہ بھی بیٹھ رہے۔

پرانا قلعہ ان دنوں گوجروں کی بستی تھی اور سڑک کے دونوں طرف دلّی دروازے

سے نظام الدین تک جنگل، نہ رات دن لاریاں موٹریں دوڑتی تھیں نہ تانگوں کا تانتا تھا۔ کبھی کبھی اِکّے بہلیاں یا اونٹ گاڑیاں دکھائی دے جاتیں۔ پیدل جانے والے بھی صبح سے شام تک دس بیس ہی آتے جاتے نظر آتے۔ ہاں سترھویں کے عرس پر خوب چہل پہل ہو جاتی۔ خوانچے والے خوانچے لیے، کھلونے والے اپنی اپنی چیزیں سروں پر رکھے، نانبائی، حلوائی، بھٹیارے اپنے اپنے ٹنڈیرے ٹھیلوں پر لادے چلے جا رہے ہیں۔ مجھولیاں، شکرمیں، پالکی گاڑیاں، یکّے بیلے سنورے گھڑدوڑ لگا رہے ہیں۔ تیس چالیس برس پہلے تک ہانڈی شاہ کا مزار تو تھا، مگر نہ یہ ہنڈوں کی نمائش تھی نہ چند اہل ِباطن کے سوا اس مزار پر کوئی فاتحہ پڑھتا، منّتیں ماننا اور ہنڈیاں چڑھانا تو کیا؟ یہ جگہ تقریباً دلّی اور نظام الدین کے آدھوں آدھ رستے پر ہے۔ گرمی کے موسم میں مسافروں کو پانی کی بڑی تکلیف ہوتی۔ دھوپ کی شدّت خاک کا اڑنا، خاص طور پر عرس کے دن لوگ کبھی کبھی پانی کے لیے پھڑک پھڑک جاتے۔ کوئل نے شہر سے نکل یہیں کہیں کسی ٹوٹے پھوٹے مقبرے میں اپنا آشیانہ بنا لیا اور سڑک کے کنارے دو چار مٹکے رکھ کر سبیل لگا دی۔ بدلا ہوا روپ تھا۔ اوّل اوّل تو کسی نے پہچانا نہیں۔ آتے جاتے مسافر درختوں کے سایے میں بیٹھتے، منھ ہاتھ دھوتے، ٹھنڈے ہوتے، پانی پیتے، سستاتے اور اپنا راستہ لیتے۔ سبیل لگانے والے کو کون پوچھتا۔ کسے اتنی پڑی تھی کہ اس کے حال کی کرید تا۔ ڈر ہوتا کہ فقیر یا تکیے دار کچھ سوال نہ کر بیٹھے۔

پرانے قلعے کے شریر گوجروں کو اس سے بَیر ہو گیا تھا، اس لیے کہ ان کی بٹ ماری میں فرق آگیا۔ سڑک پر ایک قسم کی چوکی لگ گئی تھی۔ بیچارے کے کبھی مٹکے پھوڑے جاتے، کبھی اس کے چبوترے پر لید گوبر ڈال دیتے۔ اپنے کنویں سے اس کا پانی بھرنا بند کردیا۔ غریب کو دور دور سے پانی لانا پڑتا۔ دن بھر مٹکوں کی چوکسی کرتا اور شام کو تھوڑی نیند لے کر پہلے پانی بھرتا، پھر اندھیری رات ہوتی تو اندھیرے میں، چاند نکلا ہوا ہوتا تو چاندنی میں اکیلا تالیاں بجا بجا کر خوب لہکتا، خوب مٹکتا اور صبح تک یہی سانگ رکھتا۔

اس کے چبوترے پر ایک دن عصر کے وقت دو چار نمازی مسافر بھی آگئے اور انھوں نے اذان دے کر نماز پڑھی۔ کسی گوجر نے دیکھ لیا۔ اس نے جا اوروں سے کہہ دیا: ”ارے، اب تو ماہڑے پڑوس اَجان بھی ہونے لگی، نماج بھی لوگ باگ پڑھنے لگے۔ آج سورے کو مار گیرو۔“

آدھی رات کو دو چار مرد، دو چار عورتیں مل کر کوئل کے تکیے پر آئے تا کہ اس کا بکھیڑا صاف کردیں۔ سڑک کے ابھی اس پار تھے کہ گانے کی آواز کانوں میں پڑی۔

ایک جاٹ: ارے یہ گائے کون ہے؟

دوسرا: واہ جی واہ، آواج بھنبیری ہے۔

ایک عورت: زنانوں کے گیت گائے ہے۔

پہلا جاٹ: تالیاں بھی ویسے ہی پیٹے ہے۔

دوسری عورت: ماہرا کیا بگاڑے ہے، کاہے کو ستاؤ ہو۔ آجا رے چھورے آ جا۔ جانے بھی دے۔

دوسرا: ہاں کا کا، غریب ہمارا کیا لے ہے۔ کہہ دیں گے کہ اَجان وجان، نماج وماج نہ پڑھوائے اور ماہرے کسی کام میں نہ بولے۔

دوسری عورت: چل تو ابھی کہہ دے نا۔ پاس سے گانا بھی سن لیں گے۔

کوئل کی آنکھیں بند تھیں۔ ہاتھ مٹکا مٹکا اور تالیاں پٹخار پٹخار کر مٹک رہا تھا۔ ''آجا میرے سنولیا لوں تیری بلیّاں۔'' کی دھن بندھی ہوئی تھی۔ گوجر پہلے تو کھڑے تماشا دیکھتے رہے پھر یکایک انہیں ہنسی چھوٹی۔ گنواروں کا ہنسنا جیسے پہاڑی کے پتّھر لڑھکے۔ کوئل کا دھیان بہکا اور وہ سہم کر لٹھ بند گنواروں کو دیکھنے لگا۔ دو منٹ بعد جب ذرا اوسان درست ہوے تو بولا: ''چودھری، آدھی رات کو کہاں سے آرہے ہو؟''

گوجر: ارے تو گائے تو خوب ہے۔

کوئل: چودھری، میں نگوڑی گانا کیا جانوں، اپنے سنولیا کو رِجھا رہی تھی۔

گوجر: ارے یہ تو زنانہ لگے ہے۔

عورت: جب ہی ایسا مٹکے تھا۔

گوجر: چلورے گھروں کو چلو۔ رات بہت آئی۔ چھورے، اب نہ ستائیو اسے۔ گام (گاؤں) میں کہہ دیجیو کہ پانی بھرنے آئے تو کوئی نہ روکے۔

جان بچی لاکھوں پائے، مگر بستی میں سب جان گئے کہ تکیے والا زنانہ ہے۔ اب سترھویں کا عرس آگیا تھا، کوئل نے نئے کپڑے بنائے، کرتا سبز رنگا، گلِ انار دوپٹّا، اس پر دھنک ٹانکی۔ چار مٹکے پہلے تھے، چار اور لایا۔ شاموں شام ان میں پانی بھرا۔ کپڑے بدلے، بال بکھیرے اور لہک لہک کر گانا شروع کیا۔ تھوڑی دیر میں دلّی والوں کی بھیڑ لگ گئی۔ زیادہ دنوں کی بات نہ تھی، اکثر نے پہچان لیا۔ آوازے کسنے لگے۔ کوئی پھبتیاں اڑاتا، کوئی گانے کی فرمائش کرتا: ''کوئل سنے ہوے مدّت ہوگئی۔ 'خوب پردا ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں،' سنا دو۔''

'''نہیں، بھئی، میں اپنے مولا کی جوگن بنی' ہو جائے۔''

''ارے لنڈوری کو کیوں ستاتے ہو۔''

کوئل پہلے تو چپ بیٹھا رہا، پھر ''میں اپنے مولا کی جوگن بنی'' گانے لگا۔ سماں بندھ گیا۔ بہارکشوں، اِکّوں سے سڑک بھر گئی۔ اتنے میں ایک سیج گاڑی آئی۔ بھیڑ میں گھوڑے بِدک گئے اور ایسے بدکے کہ قابو میں نہ آئے۔ سواریوں کو اترنا پڑا۔ رات کے کوئی آٹھ بجے ہوں گے۔ گاڑی میں ایک سفید لمبی ڈاڑھی کے پیر صاحب تھے۔ مریدوں کی ٹولی ساتھ تھی۔

پیر صاحب: (مرید سے) یہاں لوگ کیوں اِکھٹّے ہیں؟

مرید: حضور کسی زنانے نے سبیل لگا رکھی ہے۔

پیر: لا حول ولا قوّۃ۔ زنانہ!

مرید: کہتے ہیں یہاں کا پانی بڑا ٹھنڈا ہوتا ہے۔ نوش فرمائیں تو حاضر کروں؟

پیر: زنانے کا پانی پینا حرام ہے، مگر آؤ دیکھیں تو سہی، کم بخت گا بھی رہا ہے۔ (کوئل کی صورت دیکھ کراور گانا سن کر) مردود ہے۔ شیطان نے کیا سانگ بھرا ہے۔

کوئل: (پیر صاحب کی طرف دیکھ کر) میاں میں قربان، خفا کیوں ہوتے ہو۔ ''اپنے پیا کی جوگن بنی، بروگن بنی۔''

پیر: مجسّم شیطان ہے۔

کوئل: میاں، کوئل کی کوک سے ناراض نہ ہوں، میں اپنے میاں کو رِجھا رہی ہوں۔

پیر: استغفراللہ۔ (مریدوں سے) شکرم کے گھوڑے ہو گئے؟

کوئل: میں صدقے، میں پانی لاؤں؟ کورے کورے سوندے سوندے مٹکوں کا پانی ہے۔ برف سے زیادہ ٹھنڈا۔

پیر صاحب نے نہایت غصّے سے کوئل کو دیکھا۔

کوئل: میاں، اللہ کے نام کی سبیل ہے۔ لونڈی نے نہا دھو کر مٹکے بھرے ہیں اور کچھ نہیں تو منہ ہاتھ ہی دھو لیجیے۔

یہ کہہ کر کوئل نے ایک کوری بدھنی بھری اور پیر صاحب کے پاس لے کر آیا۔ پیر صاحب کو طیش آرہا تھا۔ جریب ہاتھ میں تھی۔ جریب سے جو ٹھوکا دیتے ہیں تو بدھنی کوئل کے ہاتھ سے چھوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔

پیر صاحب کا غصّہ ذرا ٹھنڈا ہوا۔ کوئل کی مایوس شکل دیکھی تو کچھ ترس بھی شاید آگیا۔ مگر زاہدانہ غرور کی شان بھی دکھانا چاہتے تھے۔ مریدوں سے جھلّا کر کہنے لگے۔ ''عجب اتفاق ہے۔ پہلے ریل میں دیر لگی، اب شیطان نے رستا روک لیا۔ ہماری زیارت کا بندھا

ہوا وقت ہے۔ محبوبِ الٰہی کے دربار میں انتظار ہوگا۔ دیکھو بھئی، جلدی کرو۔ ایک روپیا اس بد بخت کو بھی دے دو۔ اس کا بدھنی کا نقصان ہوا ہے۔''

کوئل: (مٹکتے ہوے آگے بڑھ کر دور سے بلائیں لینے کے بعد) میں واری، یہ روپیا میری طرف سے میاں پر نچھاور کردینا۔

پیر صاحب: (غصّے اور نفرت سے) دور ہو خبیث، مجھے بھی گنہگار کرتا ہے۔ نہ ہوا آج عالمگیر کا زمانہ۔ ابھی تھوتھے تیروں اڑوا دیا جاتا۔ ایک زنانہ گندگی کی پوٹ اور محبوبِ الٰہی کا نام۔

کوئل: (تھر تھر کانپ کر) حضور، میرا تو اس روپے کو ہاتھ تک نہیں لگا ہے۔ حضور ہی کی مایا ہے۔ میاں نے قبول نہ کیا تو خادموں کے کام آجائے گا۔ میری کمائی کا تو نہیں۔

پیر صاحب کو نجانے کیا خیال آیا۔ خادم کے ہاتھ سے روپیا لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ گھوڑے ٹھیک ہوگئے تھے۔ گاڑی کی طرف چلے۔

کوئل: (پکار کر) حضور، میاں سے کہنا کہ یہ کوئل زنانے کی نذر ہے، اسے قبول کر لو اور جب تک میاں کا ہاتھ لینے کو نہ نکلے، کسی کو دینا نہیں۔

پیر: پورا شیطان معلوم ہوتا ہے۔ مسخرے کی باتیں تو سنو۔ نعوذ باللّٰہ۔

پیر صاحب مع مریدوں کے گاڑی میں بیٹھے۔ گاڑی روانہ ہوگئی۔

جنگل میں منگل تھا۔ درگاہ کے قریب سڑک سے اترتے ہی آدمیوں کی بھیڑ تھی۔ سودے والوں کا غل، دکانوں پر شامیانے تنے ہوے، قصّہ مختصر پیر صاحب گاڑی سے اترے۔ سامان اتارا گیا۔ جو ملتا، پیر صاحب کے ہاتھ چومتا۔ آپ کی تمکنت، آپ کا تقدّس، اللّٰہ اللّٰہ۔ نہایت تکلّف کے ساتھ درگاہ شریف کے اندر داخل ہوے۔ قوّالی ہو رہی تھی۔ دو خادم آگے، چار پیچھے، ہٹو بچو کرتے مزار مبارک کے حجرے میں پہنچے۔ اپنے طریق پر زیارت کی۔ فاتحہ پڑھی، چند منٹ مراقبے میں بیٹھے، اس کے بعد اٹھ کر باہر نکلنے ہی والے تھے کہ کوئل کا خیال آگیا۔ پہلے تو اس کی گنہکار زندگی کا تصوّر کرکے ناک بھوں چڑھائی، پھر نجانے کس جذبے کے تحت جیب میں ہاتھ ڈالا، روپیا نکالا اور تمسخرانہ لہجے میں آہستہ کہ کوئی دوسرا نہ سن لے، اس کے الفاظ دھرائے تھے کہ حیرت کی انتہا نہ رہی۔ حجاب آنکھوں کے سامنے سے اٹھ گئے۔ کیا دیکھتے ہیں مزار مقدّس کو حرکت ہوئی، غلاف ہٹا اور اس میں سے ایک مرمریں ہاتھ باہر نکلا۔ ہاتھ کیا چاند تھا۔ ساری شمعیں اس کے آگے ماند پڑ گئیں۔ مشک و عنبر کی لپٹوں سے تمام حجرہ معطّر ہوگیا، اور کانوں میں آواز آئی: ''ہماری کوئل

کی نذر لاؤ۔''

پیر صاحب ششدر تھے۔ غرور و تمکنت سب غائب۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ مٹّھی خود بخود کھل گئی۔ روپیا غائب ہو گیا، ہوش جاتے رہے۔ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ دیکھا محبوبِ الٰہی کا دربار آراستہ ہے اور کوئل حضور کے سامنے بیٹھا ''اپنے پیا کی جوگن بنی'' گا رہا ہے اور امیر خسرو داد دے رہے ہیں۔ آپ نے کچھ دیر کے بعد نظریں اٹھا کر پیر صاحب کی طرف دیکھا اور تیوری پر بل ڈال کر فرمایا: ''پِیری سے مِیری نہیں ملتی۔ اپنی نسبتوں پر یہ غرور! 'خاک شو پیش ازاں کہ خاک شوی۔' یہ محبوب کا دربار ہے۔ عاشق بن کر آؤ۔ سگ لِیلیٰ سے اس قدر نفرت!''

پیر صاحب کے جب ہوش ٹھکانے آئے ہیں تو ان کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ پیری مریدی، عبادت و تقدّس کا سارا طلسم ٹوٹ گیا تھا۔ رات بھر جالیوں سے لگے روتے اور تڑپتے رہے۔ بیتاب تھے کہ کس طرح صبح ہو اور کوئل سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگیں۔ خدا خدا کر کے رات گزری۔ غسل میں شریک ہوے اور فوراً ہی چل پڑے۔ سورج ابھی پورا نکلا بھی نہ تھا کہ کوئل کی سبیل کے سامنے گاڑی رکوائی۔ کوئل حسبِ معمول جھاڑو بہارو دے، منہ ہاتھ دھو اپنے چبوترے پر بیٹھا گنگنا رہا تھا۔ پیر صاحب اپنے مریدوں کو گاڑی میں چھوڑ سیدھے کوئل کے سامنے پہنچے اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے۔

کوئل: (چونک کر) میں قربان، میاں کے لاڈلے آگئے۔ بڑے سویرے سویرے لوٹ آئے۔

پیر صاحب: (نیچی نگاہیں کیے کیے) میاں کے لاڈلے تو تم ہو۔

کوئل: میں نگوڑی پاپن گندی، میاں کے دروازے کی کتیا۔

پیر صاحب: (آگے بڑھ کر کوئل کے قدموں کو چومنے کے ارادے سے) کوئل، اب تم مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹو۔ میں نے اپنی آنکھوں سے تمھارا مرتبہ دیکھ لیا۔

کوئل: (پیچھے ہٹتے ہوے) واری جاؤں۔ میں تو ایک زنانہ ہوں۔ ساری عمر گناہوں میں گزری ہے۔ حرام کے لقمے کھائے ہیں۔ توبہ توبہ۔ آپ اور میرے پاؤں چھوئیں۔ دوزخ کا کندا نہ بنائیں۔ آپ کو میرے میاں نے سہاگن بنایا ہے۔ آپ ان کے پیارے ہیں۔ مجھے اپنے پیر چھونے دیجیے۔

پیر صاحب: (بھرّائی ہوئی آواز میں) کوئل، عقیدت کا درجہ عبادت سے بہت اونچا ہے یہ بھید آج کھل گیا۔ تقدّس اور شرافت کیے سارے کثیف و تاریک پردے اٹھ گئے۔ تم مجھے زنانے نہیں مردانوں کے مردانے دکھائی دے رہے ہو۔ آج میں سمجھا ہوں:

ذات پات پوچھے نہ کوئے
ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے

اور خدا کا پیار حاصل کرنے کا بھی جو ہم سمجھے ہیں وہ طریقہ نہیں۔ نہ جانے کیا ادا اسے بھا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ جسے پیا چاہے وہی سہاگن ہو کوئل تم۔ میاں کی زبان سے سن آیا ہوں۔

کوئل: (ایک عجب قسم کی مسرّت کے ساتھ) میاں نے میرا نام لیا، سچ؟

پیر صاحب: ہاں کوئل، تمھارا نام۔

کوئل: میرا نام، ایک زنانے کا نام؟

پیر صاحب: تم ان کے سامنے بیٹھے لہک رہے تھے۔

کوئل: میں کتیا بھونک رہی تھی؟ اچھا کیا نام لیا تھا؟

پیر صاحب: سگِ لیلیٰ۔

یہ سنتے ہی کوئل نے ''اپنے پیا کی جوگن بنی'' کی ایک تان لگائی اور ہاتھوں کو اس طرح مٹکاتا ہوا جیسے کوئی سامنے ہے اور اس کی بلائیں لے رہا ہے زمین پر گر گیا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور سر کے بالوں کی نقاب منہ پر۔ پیر صاحب نے بڑھ کر جو اٹھانا چاہا تو وہاں کیا رکھا تھا۔

(بشکریہ، اشرف صبوحی دہلوی، ''غبارِ کارواں'' [کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۶۰]، صفحہ ۳۷ تا ۴۹)